بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، أما بعد

مغربی اَفکار سے متأثر تفسیری التباسات

تمہید:

یہ بات اِس سے پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے، اور اَب بھی عرض کی جاتی ہے کہ اِس وقت ''دینِ اِسلام'' کے، سلف صالحین سے منقول ومتوارث تصور کو بدلنے کی جو عالمی سازش چل رہی ہے، اُس کے مرکزی نقطے تین ہیں: تحریف وتبدیل، دجل وتلبیس، اور زیغ وفتنہ، ان میں بھی سب سے زیادہ گہرے اثرات اور دوررس نتائج کا حامل ''تحریف وتبدیل'' کا فتنہ ہے، اِس لیے کہ جب کتاب وسنت کی نصوص ہی بدل جائیں، اور ان کے معہود ومتوارث مفہوم ہی سے چھیڑ چھاڑ کردی جائے؛ تو پھر ''اِسلام'' کا نیا ایڈیشن تیار کرنے میں کوئی چیز حائل نہیں رہ جائے گی، جیسا کہ جدید تعلیم یافتہ اور مغرب کے دِل دادہ بہت سے اَفراد وطبقات میں یہ سلسلہ ایک مدت سے جاری ہے۔

اگر یہ خطرناک دینی اِنحراف صرف اِس اِلحادی طبقے میں ہوتا تو معاملہ پھر بھی قابو میں کیا جا سکتا تھا، مگر حیرت وافسوس کا مقام یہ ہے کہ ہمارے اِردگرد پائے جانے والے بعض دین پسند اَفراد وطبقات بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس راستے کی طرف مائل ہوتے رہے ہیں۔

اِس لیے ضروری ہے کہ اِس مسئلے کو پوری حساسیت، گہرائی اور سنجیدگی سے دیکھا جائے، اور ایسے طبقات اور افراد کی کتابوں اور مضامین سے چوکنا رہا جائے، جو دینِ اِسلام کی مخلصانہ خدمت کے جذبے کے باوجود، کمالِ سادگی سے دشمن کی سازشی چالوں کا پہلے خود شکار ہوتے ہیں، اور پھر پورے دینی معاشرے کے اِغواء واِضلال (گمراہی) کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

اِس طبقے کی طرف سے ''علم''، ''عقل'' اور ''عبادت'' جیسی بنیادی شرعی اصطلاحات میں، متوارث اِسلامی تصور کو چھوڑ کر، دشمنوں کے دیئے ہوئے جدید اِلحادی تصورات کو قبول کر لینا؛ اسی ذہنی وفکری مرعوبیت کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

اِظہارِ حقیقت:

بعض مخلص اَحباب کی فرمائش پر شروع کیے جانے والے اِس سلسلۂ مضمون میں ''تفسیر''، ''مفسرین'' اور ''مغربی اَفکار'' سے متعلق جو معروضات پیش کی جائیں گی؛ اُن میں اِس موضوع کے خاص ماہر اپنے پھوپھی زاد بھائی اور بہنوئی جناب مولانا حکیم فخر الاسلام صاحب مظاہری علیگ کے تقریری وتحریری اِفادات سے بطور

خاص اِستفادہ کیا گیا ہے۔فجزاہ اللّٰہ عني وعن أهل العلم خير ما يجزي به المحسنين المخلصين.

اللہ تعالیٰ اِخلاص اور اِعتدال کے ساتھ اِس خدمت کی توفیق ارزانی فرمائیں، ستاری کا معاملہ فرماتے ہوئے شرفِ قبول عطا فرمائیں، میرے لیے ذخیرۂ آخرت، اور مسلمان بھائیوں کے لیے ذریعۂ ہدایت بنائیں۔

وصلى اللّٰه تعالى على خير خلقه محمد وآله وأصحابه أجمعين، وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه رب العالمين، آمين.

محمد معاویہ سعدی گورکھپوری

۲۸/ربیع الاول سنہ ۱۴۳۸ھ مظاہر علوم، سہارنپور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، أما بعد

برسرِ مطلب

قرآن کریم: اللہ رب العالمین واحکم الحاکمین کا کلام ہے، جو بندوں کی ہدایت اور اُخروی نجات کے لیے عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے، اِس کا حق تو یہی تھا (اور اُمت کے ایک بڑے طبقہ میں اِسی کا معمول بھی رہا) کہ یہ جس زبان میں اُترا ہے، بندے اُسی زبان کو سیکھتے، اور اُسی زبان میں اِس کلام الٰہی کو پڑھتے اور سمجھتے، مگر کچھ تو لوگوں کی سہولت پسندی کی وجہ سے اور کچھ بحیثیتِ مجموعی اُمت کے اندر تکاسل وتغافل کے پیشِ نظر، ہر زمانہ اور ہر علاقہ کے علمائے کرام اپنی اپنی زبانوں میں بھی اِس کے ترجمہ وتفسیر کا اہتمام فرماتے رہے، تا آں کہ بارہویں صدی ہجری کے قریب اُردو زبان میں بھی اِس کے ترجمہ وتفسیر کا آغاز ہوگیا، پھر ''شاہانِ دہلی'' (خانوادۂ ولی اللّٰہی) کے بعد سے تو اِس سلسلہ کو رواج عام ہی حاصل ہوگیا۔

تفسیرِ قرآن: اہل حق اور اہل باطل

جس میں اگر ایک طرف اہل حق کی طرف سے ہر دور کے علماء نے وقت کے اِس تقاضے کو، کمالِ احتیاط کے ساتھ باَحسنِ وجوہ پورا فرمانے کی کوشش کی، تو دوسری طرف تجدد پسند اور منحرف طبقات بھی بزورِ زبان وبیان، شریعت کے اِس نازک ترین کام میں دخل اندازی کی جسارت کرتے رہے۔

(۱) بنظر غائر اگر دونوں طبقوں کے درمیان خطِ فاصل اور نشانِ امتیاز تلاش کیا جائے تو وہ ہے: ''منقول'' اور ''معقول'' کی کشمکش، کہ اہلِ حق کی نظر: اللہ تعالیٰ کی رضا، اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش پر ہوتی ہے، اسی لیے اُن کی تفسیر کی بناء: آثار وروایات پر ہوتی ہے، ان کے ہاں منقولات ومأثورات کو مدارِ تفسیر بناتے ہوئے ''عقل'' سے صرف اُن کے سمجھنے کا کام لیا جاتا ہے، اور ان کا مقصد: مقاصدِ قرآن (عقائد واَحکام اور اَمثال ومواعظ) کی تبلیغ، اِسلام کی طرف دعوت، اور شرائعِ اِسلام کی حفاظت ہوتا ہے، اور بس۔

جب کہ جدت پسند طبقات کے یہاں ''تفسیر'' کی بنیاد: اولاً اپنے دین، اور اپنے مذہب کے بارے میں اپنے خداوندانِ نعمت (برسرِ اقتدار طبقات) کو مطمئن کرنے، اور دوسرے نمبر پر اپنے ہم خیال اور ہم نوا طبقے کو سامانِ تسلی فراہم کرنے کی کوشش پر ہوتی ہے، خواہ اِس کے لیے کیسے بھی اِنکار، تاویل اور معنوی تحریف کی نوبت آجائے۔

اِسی لیے اِس طبقے میں ہر مفسر کی اپنی ''عقل'' اَصل معیارِ تحقیق قرار پاتی ہے، پھر اُس کے لیے نقلی مؤیدات تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اگر صراحتاً مل گئیں فبہا، ورنہ پہلے تو نصوص کو توڑ مروڑ کر اُن میں اپنے

مفروضات فٹ کرنے کی سعی ہوتی ہے، اگر کامیابی ہوگئی تو ٹھیک، ورنہ وہ بھی کوئی ضروری نہیں۔

(۲) حق و باطل کے اِن دونوں طبقات کے درمیان ایک چیز اور بھی فارق کا کام کرتی رہی، وہ یہ کہ قرآن کریم رب العالمین اور احکم الحاکمین کا کلام ہے، اُس کا لب ولہجہ شاہی ہے، اُس کا اُسلوبِ خطابی حاکمانہ ہے، اِسی لیے قرآن کریم میں ہر جگہ دو طبقات مخاطب بنائے گئے ہیں: ایک اہلِ اِیمان (أولیاء الرحمن)، دوسرے اہل کفر (أولیاء الشیطان) ﴿هو الذي خلقكم فمنكم كافر ومنكم مؤمن﴾ (التغابن:۲)۔

اہلِ اِیمان تو اُس کی رحمت، کرم، عفو، غفران جیسی صفاتِ جمال کے مورِد بن کر، مستحقِ اِعزاز واِکرام ہوتے ہیں، جب کہ کفار اُس کے غضب، لعنت، عذاب، اور قہر جیسی صفاتِ جلال کے مظہر ہوتے ہیں، اِس لیے اپنوں کے ساتھ اُس کے کرم وعنایت کی کوئی غایت نہیں، اور باغیوں کے ساتھ اُس کے غیظ وغضب کی کوئی نہایت نہیں۔

اَب اہل حق تو قرآن کریم کے اِس شاہی اور فطری لب ولہجہ کا فرق ملحوظ رکھتے ہیں، جب کہ اہل باطل: کفار کی ظاہری شان وشوکت سے مرعوب ہوکر، اَحکم الحاکمین کے کلام ہی میں معذرت آمیز تصرف شروع کردیتے ہیں، حالاں کہ خود قرآنِ کریم نے اس کی طرف نہایت لطیف پیرایے میں توجہ دلاتے ہوئے اِرشاد فرمایا ہے: ﴿لا يغرنك تقلب الذين كفروا في البلاد﴾ [آل عمران:۱۹۶] (تمھیں دھوکے میں نہ ڈال دے کافروں کا ملکوں میں دندناتے پھرنا)۔

خلاصہ یہ کہ اہل باطل کے پیش نظر صاحبِ کلام اور اُس کی مراد سے زیادہ، اپنے زمانہ کی ترقی پذیر اور طاقت وَر قوموں اور اُن کے مقبولِ عام نظریات رہے، جس کی وجہ سے ایسے لوگوں کا کام تفسیر وتشریح کے ذریعے قرآن کریم کی خدمت کے بجائے، تاویلاتِ فاسدہ، تحریفاتِ فاضحہ، معذرت خواہانہ کلمات اور تملّقانہ تحقیقات کا آمیزہ بن کر رہ گیا، جن میں سے بہت ساری باتوں کی تردید زمانہ خود کرتا رہتا ہے۔

درمیانی طبقہ:

ایک مدت تک حق و باطل کا یہ اِمتیاز پوری طرح سے واضح رہا، اور دونوں طائفوں کے درمیان نا قابلِ عبور خلیج حائل رہی، پھر کچھ عرصہ بعد اِن دونوں کے مابین ایک درمیانی طبقہ وجود میں آیا، جس کا بڑا مقصد (خود اُسی کے بقول) مسلمانوں کے درمیان موجود اِس خلیج کو پاٹنا تھا۔

خلیج ختم کرنے کی یہ مخلصانہ کوشش اگر صحیح اُصولوں پر ہوتی تو یقیناً یہ ایک قابلِ قدر کوشش تھی، مگر اِن حضرات سے دو بنیادی غلطیاں سرزد ہوئیں، جس کے نتیجے میں ان کا منصوبہ: مطلوب اور متوقع نتیجہ دینے سے قاصر رہا:

پہلی غلطی: اس سلسلہ میں سب سے پہلا اور بنیادی اصول نظر انداز کیا گیا، وہ یہ کہ اولاً یہ پتہ لگایا جاتا کہ پانی مر کہاں رہا ہے؟ اور یہ خلیج پیدا کیوں ہورہی ہے؟ لہٰذا جو اَفراد وطبقات (اِسلام کی) جڑیں کھودنے میں لگے ہوئے تھے اُن کو روکا جاتا، اور انھیں ''حق'' کو پوری طرح سے قبول کرکے، پورے طور سے ''حق'' پر آنے کی

دعوت دی جاتی: ﴿فإن بغت إحداهما على الأخرى فقاتلوا التي تبغي حتى تفيء إلى أمر الله﴾ [الحجرات:۹] (تو اگر ایک جماعت دوسرے پر زیادتی کرے تو اُس سے لڑو جو زیادتی کر رہی ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے)۔

دوسری غلطی: اہلِ باطل کی بنیادی غلطیوں کا جائزہ نہ لینے، اور اولین مرحلے میں اُن کی نشاندہی نہ کر لینے ہی کے نتیجے میں دوسری غلطی یہ ہوئی کہ خود اِس درمیانی طبقے کے بہت سے اَفراد بھی ان ہی بے اعتدالیوں میں مبتلا ہو گئے، جن کے ارتکاب سے ''اہلِ باطل'' کا یہ جدید فرقہ وجود میں آیا تھا۔

(باقی آئندہ اِن شاء اللہ تعالیٰ)

تفسیری انحرافات کی مختلف صورتیں:

ان بنیادی کمزوریوں کی بناء پر ''اعتدال پسند'' اِس طبقے کے تراجم وتفاسیر اور علمی وتحقیقی مضامین میں (زبان وبیان کی بعض خوبیوں کے پہلو بہ پہلو) عقلیت ونیچریت سے تاثر، اور مغربیت سے فی الجملہ مرعوبیت کے آثار نمایاں ہیں، جس کے نتیجے میں اس طبقے کی علمی وفکری تحریروں میں مندرجہ ذیل بے اعتدالیاں جا بجا محسوس کی جاسکتی ہیں:

(۱) بعض مرتبہ نصوصِ صحیحہ کا اِنکار (۲) معجزات وغیرہ سے متعلق نصوصِ صحیحہ میں دُور اَز کار تاویلات (۳) اِسلامی تحقیقات ونظریات سے زیادہ، یورپ والوں کی تحقیقات سے مرعوبیت (۴) مقاصد قرآن سے اِنحراف اور تجاوز کرتے ہوئے، قرآنِ کریم میں سائنسی حقائق کی تلاش۔

حالاں کہ یہ سب اُمور اہل حق کے مذہب کے خلاف اور جمہور کے مسلک کے مخالف ہیں۔

ہم یہاں مذکورہ بالا چاروں عناوین کے تحت، قائلین کی صراحت کے بغیر صرف اُن کے غلط اَفکار کے چند نمونے پیش کرنے کا اِرادہ رکھتے ہیں، تاکہ بات مدلل بھی ہوجائے، اور انصاف پسند طالبین حق کے لیے ''راہِ عمل'' متعین کرنے میں سہولت بھی ہوجائے، وباللہ التوفیق:

۱-نصوصِ صحیحہ کا اِنکار، مثلاً:

(۱) ''کعب (بن) اشرف یہودی اور ابورافع کا قتل بہ اذن آنحضرت صلعم (صلی اللہ علیہ وسلم) جس طرح ''بخاری'' (۴۰۳۷، و۴۰۳۹) میں منقول ہے، اس کو کیوں کر ''اخلاق'' کے موافق تسلیم کرلیا جائے؟'' انتہی۔

اِس کے ''اخلاق'' کے موافق ہونے کی تحقیق کے لیے ملاحظہ فرمانا چاہیے ''تصفیۃ العقائد'' (ص ۳۵ تا ۴۱، مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی، دیوبند، از: حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ)۔

(۲) ''حضرت عائشہؓ کے اجتہاداتِ فقہی اور کلامی کو زور کے ساتھ لکھنا چاہیے، یعنی طرزِ استدلال اور بیان اور عبارت سب پُر زور ہو! ''صحاح'' میں بہت سی روایتیں اُن کی شان کے خلاف منقول ہیں، خصوصاً وہ تمام روایتیں جو آنحضرت صلعم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی معاشرتِ ازواج کے متعلق ہیں، ان کا کیا علاج سونچا ہے؟ میں تو ''سیرۃ'' میں ایک مستقل بحث کرنے والا ہوں، کہ اس قسم کی تمام روایتیں منافقینِ مدینہ کے دسائس ہیں، جو لوگ اِفک میں شریک تھے، ان سے اور کیا عجب ہے؟''۔

(۳) ''...... اِس بناء پر (ابن اِسحاق کی روایت کی بناء پر) ابوطالب کے اِسلام کے متعلق اختلاف ہے،

لیکن چونکہ ''بخاری'' کی روایت عموماً صحیح تر مانی جاتی ہے، اِس لیے محدثین زیادہ تر اُن کے کفر ہی کے قائل ہیں، لیکن محد ثانہ حیثیت سے بخاری (کتاب المناقب، باب قصۃ أبي طالب) کی یہ روایت چنداں قابلِ حجت نہیں ......''۔

(۴) ''...... یہ روایت کہ حضرت حوّا کی پیدائش حضرت آدمؑ کی پسلی سے ہوئی ہے، توریت کی ہے...... بعض حدیثی روایتیں جو اِس مضمون کی مروی ہوئی ہیں اُن میں سے کوئی ایسی نہیں ہے جسے قطعی صحت کا درجہ حاصل ہو، اور قرآن مجید نے اِس سلسلہ میں سورۃ النساء اور سورۃ الاعراف میں جو کچھ کہا ہے اُس کی تعبیر اور طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے......''۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ اِس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہاں فاضل مصنف سے سخت تسامح ہوا ہے، یہ روایت صحیح بخاری (۳۳۳۱) و مسلم (۱۴۶۸) دونوں میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، اگر صحیح احادیث حجت ہیں تو ایسی صحیح اور قوی الاسناد حدیث کو کیسے رَدّ کیا جا سکتا ہے؟ قرآن کریم نے سورۂ نساء اور سورہ اعراف میں جو کچھ فرمایا ہے اس کی اور تعبیریں ہو تو سکتی ہیں، مگر ظاہر، متبادر اور مقبولِ عام تعبیر تو یہی ہے کہ حضرت حوا کو حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا کیا گیا تھا، ہم بالکل نہیں سمجھ سکے کہ مولانا نے اِس روایت کی تردید کی کیا ضرورت محسوس فرمائی ہے؟''۔

۲-:نصوصِ صحیحہ میں دوراَز کار تاویلات:

''معجزات'' (آیات وبینات اور خوارقِ عادت) کی بحث کو ہمارے قریبی اکابر میں حضرت نانوتویؒ اور حضرت تھانویؒ نے پورے طور پر محقق اور منقح کر دیا ہے، مگر ''اِلحادی طبقے'' کے ساتھ ساتھ ہمارے اِس طبقے کے بعض افراد بھی ''خوارِق عادت'' کو بھی تسلیم کرنے میں شرمندگی محسوس کرتے ہیں، مثلاً:

(۱) ''...... اگر پرندوں کا بولنا اَب بھی کھٹکتا ہے تو فرض کرلو کہ نامہ بر کبوتروں کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر ہدہد ہوگا، اور اس کے بولنے سے مقصود اُسی مضمون کا خط ہونا سمجھ لو، جیسا کہ خود اسی موقع پر قرآن مجید میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خط دے کر اس کو ملکۂ سبا کے پاس بھیجا، اسی طرح پہلے بھی خط لے کر آیا ہوگا''۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں: ''حالاں کہ یہ تاویل بھی قرآن کریم کے سیاق کے لحاظ سے کسی طرح درست نہیں، اگر ﴿عُلِّمْنَا منطق الطير﴾ پر ایمان ہے تو اس لیپ پوت کی ضرورت ہی کیا ہے؟'' (تبصرے، ص۱۳۱)۔

مفتی صاحب نے اِس موقع پر کتابِ مذکور میں موجود اِس طرح کی اور بھی بے جا تاویلات پر متنبہ کیا ہے، استفادہ کرنا چاہیے۔

(۲) ''...... حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو جو خواب دکھایا گیا تھا اس کی مراد یہ تھی کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لیے نذر چڑھادیں، یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں، بلکہ کعبہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیئے جائیں، تورات میں جابجا قربانی کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اِس خواب کو عینی خیال کیا، اور بعینہ اس کی تعمیل کرنی چاہی، گویہ خیال اجتہادی غلطی تھی جو انبیاء سے ہوسکتی ہے، گو یہ غلطی قائم نہیں رہتی، بلکہ خدا اس پر متنبہ کر دیتا ہے، اِس بنا پر گو حضرت ابراہیم علیہ السلام اِس فعل سے روک دیئے گئے، لیکن خدا نے ان کی حسنِ نیت کی قدر کی، اور فرمایا: ﴿قد صدقت الرؤيا إنا كذلك نجزي المحسنين﴾ (الصافات: ۱۰۵)''۔

مفتی محمد تقی صاحب ایک موقع پر فرماتے ہیں: ''لغت اور استعمال میں ایک لفظ کے کئی کئی حقیقی اور مجازی معنی ہوسکتے ہیں، مگر قرآنِ کریم میں متبادر اور حقیقی معنی سے عدول صرف اس وقت کیا جائے گا جب کوئی عقلی یا نقلی مجبوری ہو، علامہ بدرالدین زرکشیؒ وغیرہ نے تفسیر کے اِس اصول کو بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے'' (تبصرے، ص ۱۷۵)۔

(۳) ﴿ألم تر كيف فعل ربك بأصحاب الفيل......﴾

''...... جمہور کے نزدیک ان آیات کی تفسیر تو وہی ہے جو عام روایت کے مطابق ہے، پرندوں کا پتھر برسانا، اور اس سے ایک فوج کی فوج کا ہلاک ہو جانا؛ تعجب انگیز واقعہ ہے، لیکن محال نہیں، ممکن ہے کہ ان کنکریوں میں چیچک کے وبائی جراثیم ہوں ......، سرسید نے اس سورۃ کی جو تفسیر ''تہذیب الاخلاق'' میں لکھی تھی، اور جس سے اس واقعہ کے اعجوبہ پن کو دور کرنے کی کوشش کی تھی، وہ سرتاپا لغو اور اَغلاط سے مملو ہے......، ان آیات کے ایک اور معنی ''نظام القرآن'' کے مصنف نے اختیار کیے ہیں، اور ممکن ہے کہ ایک حد تک صحیح ہوں......:

تو نے دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟...... تو ان ہاتھی والوں کو پتھر سے مارتا تھا......'' انتہی۔

یعنی: ''ترمیهم'' کا فاعل بجائے پرندوں کو بنانے کے، مخاطب کو قرار دے دیا گیا۔

قارئین کرام صاحبِ مضمون کی وہ بے چینی صاف طور پر محسوس فرماسکتے ہیں جو اُن کو ایک ''خرقِ عادت'' کے راست طور پر قبول کرنے میں پیش آرہی ہے، آخر جب آیت کے متبادر معنی: ابرہہ کے لشکر کا ہاتھیوں سمیت، ابابیل پرندے کی کنکریوں کے ذریعہ ہلاک ہونا ہے، اور یہی جمہور کے ہاں متوارث تفسیر بھی ہے، تو پھر پہلے:

۱: مغربی اعتراض سے گھبرا کر، از خود ''چیچک کی وبا'' کا اِمکان پیدا کرنا۔
۲: پھر اپنے اِس جرم کا گراف، اور اِحساسِ ندامت کم کرنے کے لیے بات کا رخ سرسید کی طرف موڑ دینا۔
۳: اور پھر آخر میں دِل کا کانٹا حمید الدین فراہی کی آڑ میں نکالنے کی کوشش کرنا۔
کوئی بتائے کہ یہ کون سی ''تفسیر'' ہے؟ اور کیسی ''اعتدال پسندی'' ہے؟

خوارقِ عادت سے متعلق دو عمومی غلطیاں:

معجزات اور خوارقِ عادت کے سلسلے میں عموماً دو طرح کی غلطیاں پائی جاتی ہیں:

۱: **پہلی غلطی:** یہ کہ بعض حضرات ''محال و ناممکن'' اور ''خرقِ عادت'' کی شرعی اصطلاحات میں خلط کر دیتے ہیں، حالاں کہ ''موجودات'' تین قسم کے ہیں: واجب، ممتنع، اور ممکن، تو ''معجزات'' کا تعلق صرف ممکنات سے ہوتا ہے، واجب اور ممتنع سے نہیں، مثلاً جس چیز کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی نصِّ قطعی کے ذریعے جس طرح رہنا متعین کر دیا ہے، وہ چیز اُس کے خلاف کسی بھی حال میں نہیں ہوسکتی، جیسے جنت کا خوشیوں سے بھرا ہونا ''واجب'' ہے، اور جن چیزوں سے کسی چیز کو روک دیا ہے، وہ کبھی بھی اس کے برعکس نہیں ہوسکتی، جیسے جہنم میں راحت و آرام کا پایا جانا ''ممتنع'' ہے۔

جب کہ ''ممکنات'' میں دونوں پہلوؤں میں سے کوئی چیز متعین نہیں ہوتی، البتہ ''عادی'' اور ''اکثری'' ہوسکتی ہے، اور جو کچھ بھی ہوتا ہے، وہ اللہ اَحکم الحاکمین کے ہر لمحہ جاری ہونے والے اَحکام کے ماتحت ہوتا ہے، لہٰذا بعض مرتبہ ہماری توقع اور تصور کے خلاف کوئی ''خرقِ عادت'' صورت بــإذن اللہ پیش آجاتی ہے، اُس کے ثبوت کے لیے اور اُس پر اِیمان لانے کے لیے صرف اُس کا صحیح سند سے ثابت ہونا کافی ہے، عادت کے موافق ہونا، یا ہماری عقل کے دائرے میں آنا ضروری نہیں۔

۲: **دوسری غلطی:** یہ کہ بعض حضرات جادو، مسمریزم وغیرہ کی طرح ''معجزات'' کا بھی سببِ طبعی تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسا کہ مذکورہ بالا مثالوں میں دیکھا گیا، حالاں کہ ''معجزہ'' اور دیگر اُمور میں بنیادی فرق ہی یہی ہے کہ ''معجزات'' بغیر کسی سببِ طبعی کے، محض اِعزازِ خداوندی اور نصرتِ غیبی کے طور پر عطا ہوتے ہیں، جب کہ دیگر خلافِ عادت اُمور کا کوئی نہ کوئی مادی سبب ہوتا ہے: ظاہری یا مخفی۔ (باقی آئندہ ان شاء اللہ)

باسمہٖ تعالیٰ

(تیسری قسط)

۳-: مغربی تحقیقات سے مرعوبیت:

اہلِ حق کا تو ایمان الحمدللہ قرآن وحدیث کے بیان پر ہوتا ہے، مغربی اور سائنسی تحقیقات کے بارے میں ہمارے ہاں اُصول یہ ہے کہ اگر وہ قرآن وحدیث سے صراحتاً اور بداہتاً مؤید ہوں، جب تو بلا شبہ قبول کی جائیں گی، اور اگر معارِض ہوں، تو بلا تردد، ردّ کردی جائیں گی، اور اگر نہ مؤید ہوں، نہ معارِض، تو عام حالات میں اُن کے ساتھ ''**لا نُـــصـــدّق ولا نُـكـذّب**'' (نہ تائید، نہ تردید، بلکہ سکوت) کا معاملہ کیا جائے گا، ہاں جہاں دین کے لیے معاوِن بن کر آئیں تو اِستفادہ بھی کیا جاسکتا ہے، اور اگر مضر ثابت ہورہی ہوں، تو بقدر ضرر اُن سے اِعراض ضروری ہوگا۔

مگر اِسلامی فکر وعقیدہ کی کمزوری، علمی سطحیت، اور مغربی تحقیقات سے مرعوبیت کے نتیجے میں عمومی طور پر یہ مرض بھی ہمارے جدید محققین ومفسرین کے ہاں پایا جانے لگا ہے کہ وہ (فکری وتحقیقی) کسی بھی بحث وتحقیق کا حرفِ آخر قرآن وحدیث کو قرار دینے کے بجائے، یورپین مصنفین کی اَناپ شناپ باتوں کو سمجھتے ہیں، جس کے نتیجے میں اُن کی تحقیقات: اِسلامی نقطۂ نظر سے سخت مخدوش اور غیر معتبر ہوجاتی ہیں، یہاں ہم صرف تین مثالیں ذکر کرتے ہیں:

(۱) قرآن کریم میں دسویں پارے میں ہے: (التوبۃ: ۳۰) ﴿**وقالت اليهود عزير ابن الله**﴾، سیاق وسباق کی روشنی میں جمہور کے نزدیک اِس کا ترجمہ ومفہوم متعین ہے کہ ''یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں''، مگر ایک بڑے محقق صاحب کو اِس سے اتفاق نہیں، اور انھوں نے اپنی ''تفسیر'' میں پورا زور یہ سمجھانے میں صرف کیا ہے کہ یہاں ''بیٹا'' چہیتے اور لاڈلے کے معنی میں ہے، اور اپنے اِس دعوے کا منشا حکیم الامت مولانا تھانویؒ سے ایک مکاتبت میں واضح کرتے ہیں:

''......منکرین کے صرف ایک اعتراض کا جواب مجھے اَب تک نہیں ملا ہے، تلاش برابر جاری ہے، آج کل کے یہود کہتے ہیں کہ ہم عزیر کے ابن اللہ ہونے کے قائل ہی نہیں، یہ ہماری توحید پرستی پر اتہام ہے! اِس کا جواب مجھے ان ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ کر نکالنا ہے!''۔

حالاں کہ مولانا تھانویؒ نے انھیں تنبیہ بھی فرمائی کہ: ''......اگر کہیں نہ ملے تو سہل جواب یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت کوئی جماعت ایسی رہی ہوگی، جس کے خلاف کی کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں''۔

مگر محقق صاحب کو اِس جواب سے تشفی نہیں ہوئی، اور انھوں نے یہود کے دعوی سے متاثر ہوکر، بعض ضعیف اقوال کو آڑ بناتے ہوئے، آیت کے مفہوم میں بے جا تاویل کرہی دی، اور اتنا بھی خیال نہ فرمایا کہ قرآن کریم کے نص صریح کے بالمقابل یہود کے دعاوِی کا اعتبار ہی کیا ہے، اُن کو تو توریت میں تحریف کا بھی قرآنی دعوی تسلیم نہیں، اور اپنا ''مغضوب

علیہم ‘‘میں سے ہونا بھی تسلیم نہیں، تو (العیاذ باللہ) قرآن کی کن کن خبروں کی یہودی کتابوں سے تصدیق کا انتظار کیا جائے گا؟

اور یہ بات بڑی عبرت کی ہے کہ اَب کچھ جدید تحقیقات اسی طرح کی آرہی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کی ایک جماعت کا یہ عقیدہ رہ چکا ہے، ممکن ہے اَب بھی ہو، مگر موجودہ یہود ’’تقیہ‘‘ کرتے ہوں۔

(۲) یہی طرزِ عمل اُن محقق صاحب نے فرعون کے وزیر ’’ہامان‘‘ کے وجود و عدمِ وجود سے بحث میں بھی اِختیار کیا (القصص:٦)، اور صرف مغربی تحقیقات میں ’’ہامان‘‘ نامی کسی وزیر کا تذکرہ نہ ملنے کو بنیاد بنا کر، اُنھوں نے قرآنِ کریم میں وارد اِس شخصی نام کو بے وجہ منصبی لقب ثابت کرنے کی کوشش کی۔

حالاں کہ بقول مولانا حکیم فخر الاسلام صاحب زید مجدہ: اَب مغرب کی جدید تحقیق میں ’’ہامان‘‘ نامی وزیر ہونے کے بھی قرائن و شواہد فراہم ہوگئے ہیں! ﴿فاعتبروا یا أولي الأبصار﴾۔

(۳) قرآن کریم میں متعدد جگہ صراحت کے ساتھ آسمان کے ایک واضح حقیقت ہونے اور ایک عینی مخلوق ہونے کا ذکر آیا ہے، ایک موقع پر تو یہ بھی اِرشاد ہے: (الم السجدة:١٢) ﴿فقضاهن سبع سماوات في يومين، وأوحى في كل سماء أمرها﴾ (پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو دو دنوں میں تیار کیا سات آسمان کے طور پر، اور ہر آسمان سے متعلق اپنے احکام جاری کیے)، ایسی کھلی ہوئی تصریح کے باوجود ایک مفسر صاحب فرماتے ہیں:

’’زمین کی طرح آسمان کی ہیئت سے قرآن مجید یعنی دنیا کے اِس اخلاقی اور روحانی نظام نامہ کو کوئی تعلق نہیں، آسمان کوئی ٹھوس مادّی جسم رکھتا ہے، یا محض خلاو منتہائے نظر ہے، اِس قسم کے مسائل کا تعلق تمام تر دُنیوی تجربی علوم سے ہے، قرآن کو تو آسمان کا صرف وہی وَصف بیان کرنا تھا جو سلسلۂ عبدیتِ بشری و خلافتِ الٰہی سے تعلق رکھتا تھا‘‘۔

اِس پر تبصرہ کرتے ہوئے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

’’بلاشبہ ہیئت کے مسائل قرآن کریم کا موضوع نہیں، لیکن جب خود قرآنِ کریم نے سات ’’تہ بر تہ‘‘ آسمانوں اور اُن کے دروازوں کا صراحۃً ذکر فرمایا ہے ﴿الذي خلق سبع سماوات طباقاً﴾ تو اُسے محض خلاو منتہائے نظر سمجھنے کا احتمال باقی ہی کہاں رہا؟ رہ گئی موجودہ سائنس دانوں کی بات تو وہ زیادہ سے زیادہ ’’عدمِ علم‘‘ ہے، ’’علمِ عدم‘‘ تو نہیں‘‘ (تبصرے، ص۱۸۴)۔

ایک چوتھی مثال ’’ذوالقرنین‘‘ کی بھی ہے، جن کا تذکرہ قرآن کریم میں بہت تفصیل اور اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے، مگر یہ جدت پسند محققین نعوذ باللہ اَبھی مغرب کی تائید کے انتظار میں بیٹھے ہیں، جب وہاں سے کوئی اِشارہ ملے گا جب یہ بڑے فخر سے کہیں گے کہ ہمارے قرآن نے تو چودہ سو سال پہلے ہی خبر دے دی تھی، مگر فی الحال قرآن کی اِس خبر کو بطور ایمان بالغیب کے، اِس لیے تسلیم کرنے، یا اِظہارِ تسلیم میں حجاب ہو رہا ہے کہ اہلِ مغرب کو منوائیں گے کیسے؟ فإلى الله المشتكى.

۴-: قرآنِ کریم سے "سائنسی حقائق" کے اِثبات میں غلو:

شرعی حیثیت سے اِس خطرناک روِش کی ابتدا ہندوستانی اہلِ قلم میں سرسید احمد خاں، اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب سے ہوئی، مگر اِس طرزِ عمل پر نکیر کرتے ہوئے حکیم الامت مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں کہ:

"ان چیزوں کو قرآن میں ٹھونسنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پچاس برس کے بعد اگر کوئی ان تحقیقات کا نافی پیدا ہو گیا اور تم نے ان تحقیقات کو قرآن کا جزو تسلیم کر لیا تھا تو وہ بہت آسانی سے قرآن کی تکذیب کر سکے گا" (ملفوظات حکیم الامت ج۲، ص۲۷۶)۔

ایک اور جگہ اِرشاد فرماتے ہیں:

"صاحبو! یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا ہے، یہ سخت مضر ہے......، اس میں بڑی دشمنی ہے اسلام کے ساتھ، اس لیے کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سائنس کے مسائل منقح نہیں ہوئے، اس کو اہلِ سائنس بھی مانتے ہیں کہ ہم کو اَب تک اس دریا کا قطرہ بھی حاصل نہ ہوا، پس جب کہ مسائل منقح نہیں ہوئے تو اگر آپ نے کسی جدید تحقیق کو قرآن شریف کا مدلول بنایا، اور سو برس بعد یہ تحقیق غلط ثابت ہوگئی (مثلاً ڈارون کا نظریہِ اِرتقا)، اور دوسری تحقیق نئی ہوئی، تو اس میں تکذیب، کلام الٰہی کی بھی لازم آئے گی، پس یہ لوگ ﴿یصدون عن سبیل اللّٰہ﴾ کے مصداق بن رہے ہیں، غرض یہ کوشش کرنا کہ سب چیز قرآن شریف سے ثابت ہو سخت حماقت ہے..." (اشرف الجواب ص۳۳۶)۔

اہلِ زیغ وضلال کے ہاں اِس طرح کے اِنحرافات کا پایا جانا کوئی نئی چیز نہیں تھی، مگر "دین پسند" حلقوں کی طرف سے ایسی بے اعتدالی کی راہ اِختیار کرنا سخت موجبِ تشویش ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اَب "اہلِ حق" کی طرف براہِ راست انتساب رکھنے والے اَفراد بھی ان خرابیوں میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں، اور "قرآن کریم میں سائنسی حقائق" کے موضوع پر حق وباطل سے مخلوط، اور رطب ویابس سے بھرپور مواد دینی معاشرے میں تیزی سے جگہ بناتے جا رہے ہیں۔

"سائنس اور قرآن" کے نام سے مستقل کتابیں آئی چلی جا رہی ہیں، جن میں سب زیادہ سخت صدمہ اور افسوس مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہم جیسی معتبر اور مستند شخصیت کے تائیدی مقدمہ کے ساتھ آنے والی، مولانا محمد ولی رازی کی کتاب کو دیکھ کر ہوا، کیوں کہ اِن حضرات کا شمار یقینی طور پر اہلِ حق کے معتمد ترجمانوں میں ہوتا ہے: چوں کفر از کعبہ خیزد کجا ماند مسلمانی؟

اِس کتاب کا اہم اور بنیادی ماخذ ڈاکٹر ہارون یحیٰ کی تحقیقات کو قرار دیا گیا ہے، اور وہ ترکی کا رہنے والا ایسا شخص ہے جس کے ذاتی اَحوال سخت مخدوش بتائے جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

آیئے ہم اِس خطرناک دینی اِنحراف کے چند نمونے، اور اُس کے برے اثرات آپ کو دکھلاتے ہیں:

۱-: نظریہ عظیم دھماکہ (Big Bang theory):

قرآن کریم میں ہے: ﴿اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا

﴿فَفَتَقْنٰهُمَا﴾(الأنبياء: ۳۰) ،جس کا ترجمہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے یہ کیا ہے: ''جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے، کیا اُنھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ سارے آسمان اور زمین (پہلے) بند تھے، پھر ہم نے انھیں کھول دیا''۔

اُس کے بعد تفسیر میں مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''اکثر مفسرین کی تفسیر کے مطابق اِس آیت میں آسمان کے بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُس سے بارش نہیں ہوتی تھی، اور زمین کے بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُس سے کوئی پیداوار نہیں ہوتی تھی، اور ان دونوں کو کھولنے کا مطلب یہ ہے کہ آسمان سے پانی برسنے لگا، اور زمین سے سبزیاں اُگنے لگیں۔ یہ تفسیر متعدد صحابہ اور تابعین سے منقول ہے (اور مولانا تھانویؒ نے بھی اِسی کو اختیار کیا ہے۔ معاویہ)، لیکن دوسرے بعض مفسرین نے اس کی یہ تفسیر بھی کی ہے کہ آسمان اور زمین دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اور یک جان تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن کو الگ الگ کیا'' (توضیح القرآن، ج۲ص۹۹۱)۔

اِس آیت کی تفسیر میں سلف سے منقول مختلف اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے اتنی بات بہت کافی اور شافی ہے، مگر ہمارے بعض معاصرین نے یہاں یہ بات کہہ دی:

''سائنس اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ پوری کائنات کا ایک ہی وجود تھا، ایک دھماکہ کے ذریعہ اس کے حصے بکھرے (بخرے؟) ہوئے اور اس طرح وہ نظامِ شمسی وجود میں آیا، جس کا حصہ یہ عالمِ ارض ہے، قرآن مجید نے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس کی طرف اِشارہ کیا ہے......''۔

مولانا حکیم فخر الاسلام صاحب مظاہری فرماتے ہیں: ''غور کیجئے کہ کیا یہ تحقیق مذکورہ قرآنی آیت سے ثابت کی جاسکتی ہے؟ جدید سائنس کا دعویٰ ہے کہ کروڑوں اربوں سال پہلے اس کائنات کا وجود کسی خاص نقطے پر ایک زبردست دھماکہ سے ہوا تھا، وہ اِس دھماکہ کو Big Bang کا نام دیتے ہیں۔ کیا اِس کی اُن کے پاس نقلی، عقلی یا مشاہدتی کوئی دلیل ہے؟ یا محض ظن وتخمین ہی ہے؟ اگر صرف ظن وتخمین ہے (اور ہے بھی یہی) تو اِس کو قرآن جیسی قطعی اور ابدی کتاب کا مدلول کیوں کر بنایا جاسکتا ہے؟ کیا اُن کا یہ دعویٰ قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ میں موجود تخلیقِ عالَم سے متعلق اُن تفصیلات سے میل کھاتا ہے؛ جن میں آسمان وزمین سمیت اِس پورے نظامِ شمسی کے چھ دنوں میں پیدا کیے جانے کی بات واضح طور پر فرمائی گئی ہے؟ (الٓمٓ السجدۃ:۴)﴿الله الذي خلق السماوات والأرض وما بينهما في ستة أيام﴾ (اللہ ہی کی وہ ذات ہے جس نے آسمانوں، زمین اور اُن کے درمیان کی تمام چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا)''۔ (باقی آئندہ ان شاء اللہ)

باسمہ تعالیٰ

(چوتھی قسط)

آیئے ہم اِس خطرناک دینی اِنحراف کے چند نمونے، اور اُس کے برے اثرات آپ کو دکھلاتے ہیں:

ا-:نظریہ عظیم دھماکہ(Big Bang theory):

قرآن کریم میں ہے:﴿**اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا**﴾(**الأنبياء: ٣٠**)، جس کا ترجمہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے یہ کیا ہے:''جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، کیا اُنھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ سارے آسمان اور زمین (پہلے) بند تھے، پھر ہم نے انھیں کھول دیا''۔

اُس کے بعد تفسیر میں مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''اکثر مفسرین کی تفسیر کے مطابق اِس آیت میں آسمان کے بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُس سے بارش نہیں ہوتی تھی، اور زمین کے بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُس سے کوئی پیداوار نہیں ہوتی تھی، اور ان دونوں کو کھولنے کا مطلب یہ ہے کہ آسمان سے پانی برسنے لگا، اور زمین سے سبزیاں اُگنے لگیں۔ یہ تفسیر متعدد صحابہ اور تابعین سے منقول ہے (اور مولانا تھانویؒ نے بھی اِسی کو اختیار کیا ہے۔ معاویہ)، لیکن دوسرے بعض مفسرین نے اس کی یہ تفسیر بھی کی ہے کہ آسمان اور زمین دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے اور یک جان تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن کو الگ الگ کیا'' (توضیح القرآن، ج۲ص۹۹۱)۔

اِس آیت کی تفسیر میں سلف سے منقول مختلف اقوال کو سامنے رکھتے ہوئے اتنی بات بہت کافی اور شافی ہے، مگر ہمارے بعض معاصرین نے یہاں یہ بات کہہ دی:

''سائنس اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ پوری کائنات کا ایک ہی وجود تھا، ایک دھماکہ کے ذریعہ اس کے حصے بکھرے (بخرے؟) ہوئے اور اس طرح وہ نظامِ شمسی وجود میں آیا، جس کا حصہ یہ عالمِ ارض ہے، قرآن مجید نے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس کی طرف اِشارہ کیا ہے......''۔

غور کیجیے کہ کیا یہ تحقیق مذکورہ قرآنی آیت سے ثابت کی جاسکتی ہے؟ جدید سائنس کا دعوی ہے کہ کروڑوں اربوں سال پہلے اس کائنات کا وجود کسی خاص نقطے پر ایک زبردست دھماکہ سے ہوا تھا، وہ اِس دھماکہ کو Big Bang کا نام دیتے ہیں۔ کیا اِس کی اُن کے پاس نقلی، عقلی یا مشاہداتی کوئی دلیل ہے؟ یا محض ظن وتخمین ہی ہے؟

اگر صرف ظن وتخمین ہے (اور ہے بھی یہی) تو اِس کو قرآن جیسی قطعی اور ابدی کتاب کا مدلول کیوں کر بنایا جا سکتا ہے؟ کیا اُن کا یہ دعویٰ قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ میں موجود تخلیقِ عالَم سے متعلق اُن تفصیلات سے میل کھاتا ہے؛ جن میں آسمان وزمین سمیت اِس پورے نظامِ شمسی کے چھ دنوں میں پیدا کیے جانے کی بات واضح طور پر فرمائی گئی ہے؟ (الم السجدة:۴) ﴿الله الذي خلق السماوات والأرض وما بينهما في ستة أيام﴾ (اللہ ہی کی وہ ذات ہے جس نے آسمانوں، زمین اور اُن کے درمیان کی تمام چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا)۔

۲-: شہابِ ثاقب کی تحقیق:

قرآن کریم میں ایک سے زائد جگہ پر، اَسرارِ غیبی پر شیاطین کے مطلع ہونے کی کوشش کرنے، اور اُس پر فرشتوں کے ذریعے رجم کیے جانے کا تذکرہ موجود ہے، اور اِس سلسلے میں ''شہـــــاب'' کا لفظ وارِد ہوا ہے: (الحجر: ۱۸) ﴿إلا من استرق السمع فأتبعه شهاب مبين﴾، اور: (والصافات: ۱۰) ﴿إلا من خطف الخطفة فأتبعه شهاب ثاقب﴾.

مشہور یہی ہے کہ اُفق پر بعض مرتبہ جو شعلہ وغیرہ نظر آتا ہے، وہ اِسی ''رجمِ شیاطین'' کے نتیجے میں ہوتا ہے، مگر ہمارے جدید مفسرین نے سائنسی تحقیق کے پیشِ نظر اِس نظریے کی بہت پر زور تردید کی ہے، ایک صاحب فرماتے ہیں:

''لوگوں نے عام طور پر ''شهابِ مبين'' (الحجر: ۱۸) یا ''شهابِ ثاقب'' (سورة الصافات: ۱۰) سے مراد اُن ٹوٹے ہوئے تاروں کو لیا ہے، جو شب میں (خصوصاً موسمِ برسات میں) فضا میں تیزی سے گزرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، حالاں کہ قرآن مجید جس عالم کا ذکر کر رہا ہے، وہ ہماری حس ہی کے دائرہ سے بالکل باہر ہے، نہ ہم شیطانوں کو آسمان پر جاتے ہوئے دیکھتے ہیں، اور نہ فرشتوں کی مار اُن پر پڑتے ہوئے دیکھتے ہیں، اور نہ فرشتوں کے ڈر سے اُنھیں بھاگتے ہوئے، یہ سب چیزیں ہمارے لیے نا دیدہ ہیں، اور غیب کے حکم میں داخل۔

اہلِ سائنس کی تحقیق ہے کہ فضا میں بڑے بڑے وزنی پتھر چکر کھایا کرتے ہیں، اور وہ ہوا سے رگڑ کھا کر روشن ہو جاتے ہیں، اور کبھی زمین پر ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں، انھیں قرآنی ''شہاب مبین'' و ''شہابِ ثاقب'' سے اصلاً تعلق نہیں، ...... وہ بڑے سنگریزے ہوتے ہیں، جو فضائے آسمانی میں گھومتے رہتے ہیں، اور جب فضائے زمین میں آجاتے ہیں تو اِلتہاب سے چمکنے لگتے ہیں، صرف عوامی زبان میں اُنھیں ''تارے'' کہا جاتا ہے......،

اُن کو قرآن کے ''شہاب'' کا ترجمہ سمجھنا تمام تر ایک عامیانہ جہالت ہے، قرآن کے شہابوں کا تعلق تمام تر فرشتوں اور شیطان سے ہے، جو سرتاسر غیبی چیزیں ہیں''۔

سائنسی تحقیق سے مرعوب ہو کر، جس نظریے کو ''عامیانہ'' قرار دیا جارہا ہے، وہ صحیح مسلم شریف (۲۲۲۹) کی ایک حدیث میں صراحتاً مذکور ہے: ''بینما هم جلوس ليلةً مع رسول الله صلى الله عليه وسلم، رُمي بنجم فاستنار، فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم ......: فتخطف الجنُّ السمعَ، فيَقذِفون إلى أوليائهم، ويُرمَون به... '' إلخ۔ (ایک رات صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ستارا مارا گیا، جس سے روشنی ہوئی، آپ نے اصحاب سے فرمایا:...... پھر یہ جن (شیاطین) غیب کی باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں، اور وہاں سے کچھ اچک کر اپنے کاہن دوستوں تک پہنچاتے ہیں، اِس پر اُنھیں ستارے سے مارا جاتا ہے)۔

مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں: ''اور جاننا چاہیے کہ قرآن وحدیث میں یہ دعویٰ نہیں کہ بدون اِس سبب کے ''شہاب'' نہیں پیدا ہوتا، بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ اِستراق کے وقت شہاب سے شیاطین کو رجم کیا جاتا ہے، پس ممکن ہے کہ شہاب کبھی محض طبعی طور پر ہوتا ہو (جیسا کہ اہلِ سائنس کہتے ہیں)، اور کبھی (رجمِ شیاطین کی) اِس غرض کے لیے ہوتا ہو، اور اُس میں کوکب کو یہ دخل ہو کہ سخونتِ کوکب سے خود مادۂ شیاطین میں یا مادۂ بخارات میں بواسطۂ فعلِ ملائکہ کے نار پیدا ہو جاتی ہو، جس سے شیاطین کو ہلاکت یا فسادِ عقل کا صدمہ پہنچتا ہو۔ اِس تقریر پر بفضلہٖ تعالیٰ اِس بحث میں نہ کوئی اِشکال عقلی رہا، نہ نقلی، جیسا کہ ماہرانِ علوم وفنون پر مخفی نہیں'' (بیان القرآن، ج۲ ص۲۴)۔

نیز ''بوادر النوادر'' ج ا ص ۴۲ پر ہے: ''ستارے چھوٹنا کبھی رجم کے لیے ہوتا ہے، کبھی دوسرے اَسبابِ طبعیہ سے بھی، اول میں منحصر نہیں'' (بحوالہ مضمون: مولانا فخر الاسلام صاحب مظاہری)۔

اور یہ مسئلہ تو مسلمات میں سے ہے کہ کسی شے کے ایک سے زائد سبب ہو سکتے ہیں، جیسا کہ ''طاعون'' اور ''تعدیۂ اَمراض'' وغیرہ کی بحث میں علماء نے اِس مسئلہ کو پوری طرح منقح فرمادیا ہے، شریعت میں مصائب کا سبب ہماری بداعمالیوں کو قرار دیا گیا ہے، جب کہ ہم اُن کے وقوع کے ظاہری اَسباب کا خود مشاہدہ کرتے ہیں، تو دونوں میں تضاد کیا ہے؟! دونوں ہی سبب ہیں؛ ایک ظاہری، ایک باطنی۔

۳-: تلقیحِ شجر کے مسئلے میں خلط:

اِسی طرح کا سائنسی مسئلہ ایک اور آیت سے بھی ثابت کیا جاتا ہے، چنانچہ ایک مفسر صاحب فرماتے ہیں:

''پودوں میں ہوا کے ذریعہ نر پودوں کے مذکر اعضاء، مادہ پودے میں منتقل ہوتے ہیں اور اس طرح وہ بارآور ہوتے ہیں، عربی زبان میں بارآور ہونے کو''تلقیح'' کہتے ہیں، غالباً قرآن مجید کی اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: قرآن کریم کی آیت یہ ہے ﴿وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَاءً فَأَسْقَيْنٰكُمُوْهُ، وما أنتم له بخازنين﴾(حجر: ۲۲). اور ہم ہی پانی سے لائی ہوئی ہواؤں کو بھیجتے ہیں، پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں، پھر وہی (پانی) ہم تم کو پلاتے ہیں، اور تم اس کو جمع کرنے والے نہ تھے''۔

اِس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

''اور ہم نے ہوائیں بھیجیں اِس حال میں کہ وہ بادلوں کو اُٹھائے ہوئے ہیں، پھر ہم نے ہی آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے ہی اُس سے تمھیں سیراب کیا، اور تم اس کو ذخیرہ نہیں کر سکتے تھے''۔

اِس کی تفسیر میں صاحبِ ''روح المعانی'' فرماتے ہیں:

اللواقح جمع لاقح، بمعنى حامل، يقال: ناقة لاقح؛ أي: حامل ......، والمراد: مُلَقِّحات للسحاب أو الشجر، فيكون قد استعير اللقح لصبّ المطر في السحاب أو الشجر، وإسناده إليها على الأول حقيقة، وعلى الثاني مجاز، إذ الملقي في الشجر السحاب، لا الريح......إلخ۔

اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ''لواقح'' لاقح بمعنی حامل کی جمع ہے، اور یہاں مراد وہ ہوائیں ہیں جو بادلوں میں، یا درختوں تک پانی کو پہنچانے والی ہیں، پہلی صورت میں حقیقی معنی مراد ہوں گے، اور دوسری صورت میں مجازی، اِس لیے کہ پانی کو درختوں تک بادل پہنچاتے ہیں، ہوا براہِ راست نہیں پہنچاتی۔

مذکورہ تفسیر کی روشنی میں غور کر لیا جائے کہ ''مفسر صاحب'' کے پیدا کردہ احتمال کی شرعاً یا لغۃً کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اور ان کی یہ تفسیر دلالت کی کس قسم کے تحت قرآن کریم کا مدلول بن سکتی ہے؟ اگر نہیں بن سکتی تو کسی مطلب کو اَز خود قرآن کے سر مڑھنے کا کیا حکم ہے؟ اِس آیت میں تو پودوں کا اور اُن کی تلقیح و تابیر کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں، چہ جائے کہ اس کو ان کی جنس اور صنف کی تعمیر و تشکیل اور ان کی علتِ فاعلی کی تفصیل کا ماخذ بنایا جائے۔ (جاری)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ
(پانچویں قسط)

۴-: اَشیا میں مسئلۂ زواج سے متعلق سائنسی نظریہ:
پودوں میں نر ومادہ دو الگ الگ نوع ہوتی ہیں یا نہیں؟ اگر ہوتی ہیں تو ان کی ’’تزویج‘‘ کی کیا صورت ہوتی ہے؟ یہ ایک خالص سائنسی مسئلہ ہے، قرآن شریف کا موضوع نہیں ہے، مگر بعض معاصرین قرآنی ’’تفسیر‘‘ میں فرماتے ہیں: ’’قدیم ترین عہدسے انسان یہ تصور کرتا رہا ہے کہ مذکر ومؤنث کا نظام صرف جانداروں میں ہے؛ لیکن سائنس کی موجودہ تحقیق نے ثابت کیا ہے، کہ یہ نظام نباتات میں بھی ہے اور جمادات میں بھی، یہاں تک کہ الیکٹرک کی پیدائش میں بھی مثبت اور منفی پہلوؤں کا دخل ہوتا ہے، قرآن مجید نے اس حقیقت سے پردہ اُٹھاتے ہوئے کہا ہے:(الذاریات: ۴۹){**ومن کل شيء خلقنا زوجين لعلكم تذكرون**} (اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں، شاید کہ تم اس سے سبق لو)، اور (یسٓ: ۳۶) {**سبحان الذي خلق الأزواج كلها مما تنبت الأرض ومن أنفسهم ومما لايعلمون**} (وہ ذات جس نے سب چیز کے جوڑے بنائے، خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں، یا خود ان کی اپنی جنس یعنی نوع انسانی میں سے، یا ان اشیاء میں سے جن کو وہ نہیں جانتے)‘‘ (مقدمۂ تفسیر، ص ۶۵)۔
اِس کے برخلاف حضرت تھانویؒ ’’بیان القرآن‘‘میں اِس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:
۱-: ’’وہ پاک ذات ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا، نباتات وزمین کے قبیل سے بھی (خواہ مقابلہ: مماثلت کا ہو، جیسے ایک طرح کے غلے، ایک سے پھل، خواہ مقابلہ مضادت (تضاد) کا ہو، جیسے گیہوں اور جو، اور شیریں اور ترش پھل، یا اس سے بھی زیادہ اختلاف ہو، بشرطیکہ مقولاتِ عشر میں سے کسی مقولے کے تحت میں داخل ہو؛ بلاواسطہ، جیسے جزئیات اور

اَجناس سافلہ، یا بواسطہ جزئیات کے، جیسے اجناس عالیہ، کہ ان کی جزئیات کسی مقولے میں ضرور داخل ہیں)، اور (خود) ان آدمیوں میں سے بھی (جیسے مرد اور عورت)، اور ان چیزوں میں بھی جن کو (عام) لوگ نہیں جانتے(کہ باعتبار مفہوم عام مقابلہ کے؛ اشیائے مخفیہ میں بھی کوئی شے
مقابل سے خالی نہیں ...)۔ انتہی ملخصاً۔
۲-: حضرتؒ اپنے ایک ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں: ''ایک صاحب نے قرآن شریف سےیہ ثابت کرناچاہاہے کہ دانہ میں نصف مادَہ اورنصف نرہوتاہے، یہ بھی سائنس جدیدکی تحقیق ہے، اس کے لیے ان کویہ آیت مل گئی ہے: {**سُبْحانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ** }کہ اس میں بھی ''اَزْوَاج'' یعنی میاں بیوی ہیں، جوجس کی سمجھ میں آتاہے وہ کہتاہے، نہ معلوم یہ لوگ {**وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ**}کے کیا معنی کہیں گے؟ تزویج (بابِ) تفعیل ہے زوج سے، اس کے معنی ان کی تقریرکے موافق میاں بی بی بنانے کے ہوئے، تو یہ معنی ہوئے کہ قیامت کے دن لوگوں کے نکاح کرائے جائیں گے!''حالاں کہ آیت کے اصل معنی یہ ہیں: ''جب ایک ایک قسم کے لوگ اکٹھے کیے جا ویں گے (کافر الگ، مسلمان الگ، پھر اُن میں ایک ایک طریقہ کے الگ الگ) ''۔
۳-: برادرِ گرامی مولانا حکیم فخرالاسلام صاحب (مظاہری، علیگ) زیدمجدہ فرماتے ہیں: ''(زوج) کے ایک مطلق لفظ کو نر و مادہ، مثبت و منفی، کے ساتھ مقید کر دینا، امورِ ذیل کی روشنی مینبالکل بے دلیل بلکہ خلافِ دلیل ہے، اس لیے شرعاو عقلا نا زیبا ہے:
(الف) اگر ''اَزواج'' کے مضمون میں مرد و عورت، نرو مادہ شامل بھی ہوں جیسا کہ دلالتِ تضمنی کے طور پر یہ چیزیں بھی داخل ہیں، تو اس میں جدید سائنس کے مسئلہ کی کو ن سی خصوصیت اور انوکھا پن تھاکہ جسے ظاہر کرنے کی فکر ہوئی، پودوں میں نرو مادہ کا ہو نا تو اہل عرب بھی اپنے تجربہ

کی بنا پر جا نتے تھے، اسی لیے ''تابیر نخل'' کیا کرتے تھے، جیسا کہ اَحادیثِ صحیحہ میں مذکور ہے۔
(ب) جدیدسائنس کے اکتشاف کو مرادِ خداوندی کے اِظہار میں کو ئی دخل اس لیے بھی نہیں ہے کہ قرآنی آیت میں لفظ ''ازواج'' کا مدلول محض نر ومادہ ہی تو نہیں ہیں، بلکہ اگر نر و مادہ اس آیت کے مصداق میں شا مل ہو ں، تو بھی مقصود حاصل ہے، اور اگر کسی صنف میں نر و مادہ کا تحقق نہ ہو تو بھی مقصود حاصل ہے، نیزنر ہی نر، یا مادہ ہی مادہ کے تقابل کا اگر لحاظ ہو ، اس سے بھی قرآن کا مقصود حاصل ہے، لیکن سائنسی تحقیق اس کے ساتھ فٹ نہ ہوسکے گی،کیوں کہ سائنسی
تحقیق میں مثبت و منفی کے درمیان تقابلِ تضاد کا لحاظ ہے،جب کہ آیت قرآنی میں اس سے بڑھ کر مثبت کا مثبت سے، اور منفی کا منفی سے بھی تقابل ملحوظ ہے۔
چنانچہ آیت (الذاریات: ۴۹) {**وَمِنْ كُلِّ شيئٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْن**}کی توضیح کرتے ہوئے ''بیان القرآن'' میں یہ تفسیر کی گئی ہے: ''
اور ہم نے ہر چیز کو دو دو قسم کا بنا یا (اس قسم سے مراد مقابل ہے، سو ظاہر ہے کہ ہر شے میں کو ئی نہ کوئی صفتِ ذاتیہ یا عرضیہ ایسی معتبر ہو تی ہے جس سے دوسری چیز جس میں اُس صفت کی نقیض یا ضد ملحوظ ہو، اس کے مقابل شمار کی جاتی ہے، جیسے آسمان وزمین، جوہر وعرض، گرمی وسردی، شیریں وتلخ، چھوٹی وبڑی، خوشنما وبد نما، سفیدی
وسیاہی، روشنی وتاریکی... وعلیٰ ہٰذا)''۔
لیجئے اس کی روشنی میں تو ایک چیز جس کی مزاجی کیفیت اسی جیسی دوسری چیز سے الگ ہو،وہ اس کی ''زوج ''ہے،بلکہ اس سے بڑھ کر ایک ہی مزاجی کیفیت رکھنے وا لی دو چیزیں جن کا کوئی فعل و عمل (خاصیت)صرف قوت و ضعف کے اعتبار سے دوسرے سے الگ ہو،تو وہ دونوں ایک دوسرے کی زوج ہیں، ایسی صورت میں ''پودوں تک میں سائنسی اکتشاف کے حوالے

سے نر و مادہ ثابت کرکے '' مدلول قرآنی کی تائید سائنسی اکتشاف سے دکھلانا بے جوڑ استدلال ہے۔

۵-: بیضویتِ اَرض (زمین کے گول ہونے) کا مسئلہ:

آیتِ قرآنی {**یُکَوِّرُ اللَّیْلَ عَلی النہَارِ و یُکَوِّرُالنَّہَارَ عَلی اللَّیلْ**}(الزمر: ۵)(وہ رات کو گھما کر لپیٹتا ہے دن پر اور دن کو گھما کر لپیٹتا ہے رات پر) سے بعض تجدد پسندوں نے بیضویتِ ارض (زمین کے گول ہونے) سے متعلق سائنسی دعوی کا اِثبات کیا ہے، اس موقع پر اس کو نقل کرکے بعض جدید مفسرین نے بھی یہ کہتے ہوئے اس کی تائید کی ہے: ''یہ نص ہے تکویرِزمین کی ''،پھر لغت کی شہادت کے طور پر لغوی تحقیق یہ پیش کی ہے: ''وَکُلُّ دَوْرٍ کَوْر'' ۔
مولانا فخرالاسلام صاحب فرماتے ہیں: اَب سوال یہ ہے کہ جب ہر دور، کور کہلا تا ہے، تو اس سے لیل و نہار کا دَور اور کَور تو ثابت ہوگیا، لیکن زمین کی کرویت اور بیضویت پر استدلال کیسے صحیح ہوا؟لیل و نہار کا تعلق ''اَجناسِ عالیہ''میں سے ' 'کیف'' یا ''فعل'' و ''انفعال''سے ہے، اور یہ چیزیں مقولۂ عرض سے تعلق رکھتی ہیں،جب کہ ''زمین''کا تعلق مقولۂ جوہر سے ہے، ایسی صورت میںایک کا اِطلاق دوسرے پر کیوں کر درست ہو گا؟...''۔اھ
یعنی: جو وصف اَعراض وکیفیات کے لیے ثابت ہو، اُس کو بغیر کسی دلیل کے کسی جوہر اور ٹھوس چیز کے لیے کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے؟
اسی طرح قرآن کریم کی آیت: (النازعات: ۳۰){ **وَا لْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰھَا**} (اور اُس کے بعد زمین کو بچھایا)، کے تحت مولانا نے بالکل بے محل یہ فرمادیا: ''بعض نے یہیں سے زمین کی کرویت بھی نکا لی ہے''۔

یہاں اس کی بحث نہیں کہ زمین گول ہے یا نہیں؟ سوال یہ ہے کہ کرویتِ ارض کا دعویٰ اِس آیت کا مدلول بن سکتا ہے یا نہیں؟ اور دحٰہا کے لفظ سے بیضویت کا ثبوت ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر نہیں ہوسکتا تو پھر صرف کسی مقتدِر طبقہ کو خوش کرنے کے لیے قرآن کریم میں اِس طرح کے تصرفات کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

استدلال کی بے احتیاطی دکھانے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم زمین کا مسطح ہو نا ثابت کرنا چا ہتے ہیں، ہرگز نہیں، تفسیر ''بیان ا لقرآن'' جس کا حوالہ اہلِ حق کی نمائندہ تفسیر ہو نے کی حیثیت سے بطور تقابل کے اوپر سے چلا آرہا ہے، اسی تفسیر میں ''فائدہ'' کے تحت مذکور ہے: ''وَلیس فی السطح دَلَالَۃٌ علی عَدَمِ کُر ۃِ الاَرْض، لأنہا فی النَّظَرِ مسطحۃ، وَلٰکِنْ اَنْ تَکُوْنَ فی الْحقِیْقَۃِ کُرَۃٌ اِلّا اَنَّہَا لِعظَمِہَا لَا تُدْرَکُ کُرِیَّتُہَا۔ '' (بیان ج ١٢ ص٩٥) ...، جس طرح {**وإلی الأرض کیف سُطِحَت**} میں زمین کے کروی (گول) ہونے کی نفی پر دلالت نہیں، اسی طرح { **وَا لْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰھَا**} سے زمین کے کروی ہونے کے اِثبات پر بھی دلالت نہیں ہوتی'' انتہیٰ ملخصاً۔

آخر میں مولانا حکیم فخرالاسلام صاحب نے یہ بات بھی فرمائی: ''... اور اسی سے ایک اہم اِعتراض کی بھی حقیقت کھل گئی ، جو کیا تو گیا تھا غلام جیلانی برق جیسے لو گوں کی طرف سے، لیکن اسے جناب شہاب الدین احمدندوی مرحوم نے اپنی تائید سے بے وجہ قوت دینی چا ہی، وہ اعتراض یہ ہے کہ''علماء نظامِ کا ئنات سے متعلق قرآنی آیات کی تشریح وتفسیر نہیں کرتے''۔ اِسی اعتراض کا جواب دینے کی فکر وکاوش،اہلِ علم اور فضلائے مدارس وجا معات کی طرف سے مسلسل ہو رہی ہے ...، اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے کہ بعض ایسے لو گوں نے بھی اسی روِش کی پیروی اِختیار کرلی ہے، جن کا شمار اہلِ حق کے آحاد میں ہو تا رہا، لیکن اس قسم کی روِش اِختیار کر نے کی وجہ سے

ان کا باطل اُن کے حق سے ممتاز نہیں رہ گیا،پھر یہ سلسلہ چل پڑا،چنانچہ دور حاضر میں اہل علم کی ایک قابلِ شمار تعداد اَب بھی اسی طریقہ کار کو اِختیار کیے ہوئے ہے ۔۔''۔ الخ۔
احقر عرض کرتا ہے کہ اَب یہ سلسلہ صرف علی گڑھ اور ندوہ کے حلقہ میں محدود نہیں رہ گیا ہے، بلکہ ''فکر دیوبند'' کی طرف منسوب، بلکہ اُس کے بعض نمایاں اور معتبر حضرات کے ہاں بھی بہت زور وشور سے یہ سلسلہ شروع ہوچکا ہے، اِس کا منشا کیا ہے؟ یہ مرعوبیت، جدیدیت اور فکری اِنحراف آیا کہاں سے ہے؟
...................(جاری)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

چھٹی قسط

۶-: گردشِ ارض کا مسئلہ:

سورۂ یٰسٓ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لا الشمس ينبغي لها أن تدرك القمر، ولا الليل سابق النهار، وكُلٌّ في فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ (یس: ۴۰)، اِس کا ترجمہ یہ ہے: نہ تو سورج کی یہ مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے، اور نہ رات، دن سے آگے نکل سکتی ہے، اور یہ سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں (گردش میں ہیں)۔

ایک مفسر صاحب ﴿كُلٌّ فی فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ کے تحت لکھتے ہیں: ''کُلٌّ'' کو ذرا وسعت دی جائے تو زمین (الارض) بھی اس کے مفہوم میں بلا تکلف داخل ہو سکتی ہے''۔

مولانا حکیم فخر الاسلام صاحب زید مجدہ اِس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہاں مولانا نے یہ واضح نہ فرمایا کہ ''ذرا وسعت'' کسی قاعدہ کے تحت دی جائے گی؟ یا بلا کسی قاعدے کے محض اپنی مرضی سے؟! ماقبل میں ''ارض'' کے بعد، ''انفس'' ہے، اور ''ارض'' سے پہلے ''ازواج'' ہے، ان دونوں (''انفس'' و ''ازواج'') کو بھی ''کُلٌّ'' کی وسعت کا فائدہ مل سکتا ہے یا نہیں؟ یا صرف (اہل سائنس کی تائید کے لیے) ''ارض'' ہی کو اس وسعت میں شریک کیا جائے گا؟ اگر تخصیص کا دعویٰ ہے تو یہ ترجیح بلا مرجح ہے، کوئی عقلی یا نقلی قاعدہ تو ہونا چاہیے۔

بات صرف اتنی ہے کہ گردشِ ارض کا مسئلہ ایک عقلی (اور مشاہدتی) مسئلہ ہے، جس سے قرآن کریم کی نصوص ساکت ہیں، قرآن مجید نہ اس کی تائید کرتا ہے نہ مخالفت، چنانچہ اس کی کسی آیت سے نہ سکونِ ارض ثابت کیا جا سکتا ہے، نہ حرکتِ ارض، ایسی صورت میں قرآن کریم سے حرکتِ ارض ثابت کرنے کی کوشش یقیناً غلو اور تکلف ہے۔

اور جب نص سے ثابت نہیں ہے اور اس کا مدلول بھی نہیں ہے، تو بقول حضرت تھانویؒ ''مدلولِ نص اور ثابت بالنص کہنا یقیناً تفسیر بالرائے اور تحریفِ نصوص اور سخت معصیت ہے'' (التقصیر، ص......)۔

اِس موقع پر راقم کو عرض یہ کرنا ہے کہ یہ مفسر صاحب خود ہی دوسرے موقع پر یہ فرما رہے ہیں (جیسا کہ گذر چکا) کہ: ''زمین کی طرح آسمان کی ہیئت سے قرآن مجید یعنی دنیا کے اِس ''اخلاقی اور روحانی نظام نامہ'' کو کوئی تعلق نہیں، آسمان کوئی ٹھوس مادّی جسم رکھتا ہے، یا محض خلاو منتہائے نظر ہے، اِس قسم کے مسائل کا تعلق تمام تر دُنیوی تجربی علوم سے ہے، قرآن کو تو آسمان کا صرف وہی وَصف بیان کرنا تھا جو سلسلۂ عبدیتِ بشری وخلافتِ الٰہی سے تعلق رکھتا تھا''۔

تو سوال یہ ہے کہ جب ''اِس قسم کے مسائل کا تعلق تمام تر دنیوی تجربی علوم سے ہے'' (اور یہ بات درست بھی ہے) تو پھر ان کو قرآن سے ثابت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پھر مفسر صاحب کا یہ عجیب عبرت ناک تضاد بھی ہے کہ جہاں قرآنی بیان اُن کے مزعومہ سائنسی نظریے کے خلاف پڑ رہا تھا، وہاں تو اُنھیں اُس کا اَصل موضوع مستحضر رہا، اور جہاں کسی مزعومہ سائنسی مسئلے کو ثابت کرنا تھا، تو وہاں اَصل موضوع بھی محو ہو گیا، اور اس طرح کے طریقۂ استنباط سے کام لیا گیا جیسا کہ کسی عامی نے ﴿ما کسب﴾ سے ''ماں کا سب'' کا مسئلہ ثابت کیا تھا!! فإلی اللہ المشتکی، وھو المستعان۔

قرآن کریم سے سائنسی انکشافات کے اِثبات کے نقصانات:

مذکورہ بالا چاروں عنوانات کے تحت ''اعتدال پسند؟'' طبقہ کے جادۂ اعتدال سے منحرف افکار ونظریات کی چند مثالیں پیش کرنا مقصود تھا، ان میں سے آخری بات (قرآنِ کریم میں ''سائنسی حقائق'' کی تلاش) میں بظاہر سب سے کم درجہ کی مضرت محسوس ہوتی ہے، مگر یہ بھی اِس زمانہ کا بڑا ''فتنہ'' ہے، اِس لیے کہ جب ایک مرتبہ کسی کا ذہن اِس رخ پر چل پڑا تو وہ کہاں کہاں زلتِ قدم اور لغزشِ قلم کا شکار ہو جائے؛ کچھ کہا نہیں جا سکتا، اِسی لیے حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے اِس کو بھی سختی سے منع فرمایا ہے، اِس موضوع سے متعلق حضرت کے بعض اقتباسات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

۱-: ''آج کل لوگوں نے قرآن کے ماؤضع لہ (موضوع) کو بالکل نہیں سمجھا، قرآن میں وہ چیزیں تلاش کی جاتی ہیں جو کہ قرآن کا موضوع نہیں ہیں، پھر جب کوئی فلسفہ (وسائنس) کی نئی تحقیق ظاہر ہوتی ہے، تو اس کو زبردستی قرآن مجید میں ٹھونس کر بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن نے تیرہ (چودہ) سو برس پہلے ہی اس کی خبر دی ہے، اور اس سے قرآن کی بلاغت ثابت کی جاتی ہے ...... قرآن کریم ایک ''قانون'' کی کتاب ہے، سائنس وغیرہ کا ذکر اگر اس میں آئے گا تو مقصود کے تابع ہو کر آئے گا، چنانچہ سائنس کے متعلق جو گفتگو ہوگی محض اس قدر کہ سب مصنوعات ہیں، اور ہر مصنوع کے لیے ایک صانع کی ضرورت ہے، مگر اس استدلال کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اس چیز کی حقیقت بھی دریافت ہو جائے، بلکہ مجملاً ان کا علم ہونا کافی ہے'' انتہی۔ (مأخوذ از: تعارف وتقدیم ''بیان القرآن'' ص۱۲، از: مفتی عبدالشکور ترمذی، مطبوعہ مکتبۃ الاتحاد، دیوبند)۔

قرآنِ کریم کا اصل موضوع تشریعیات ہیں، تکوینیات نہیں:

راقم عرض کرتا ہے کہ یہاں دو چیزیں ہیں: ایک تکوین (کائناتی نظام)، دوسرے تشریع (مکلّف سے متعلق

احکام)، قرآن کا موضوع: تشریعیات ہیں، تکوینیات نہیں، ہاں قرآن کریم میں متعدد مرتبہ مختلف مواقع پر آیات اللّٰہ في الکون (کائناتی نظام) میں بھی تدبر وتفکر کی دعوت دی گئی ہے، لیکن وہ بھی تشریعی حیثیت سے ہے، نہ کہ تکوینی حیثیت سے۔

البتہ چونکہ قرآن کریم خالقِ کائنات اور عالم الغیب والشہادۃ ذات کا کلام ہے، اِس لیے یہ بات متعین ہے کہ اُس کی کوئی بھی خبر، دعوی اور تحقیق خلافِ واقعہ نہیں ہوسکتی، ہماری نظر کا قصور ہوسکتا ہے، مشاہدہ میں کمی ہوسکتی ہے، فہم میں غلطی ہوسکتی ہے، حقیقت اور مجاز میں خلط ہوسکتا ہے، مگر قرآنی دعاوی اور حقائق میں کوئی تخلُّف نہیں ہوسکتا، اِس لیے ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تمام تر تحقیقات وانکشافات کی آخری کسوٹی قرآنی بیان کو قرار دے، اگر کہیں نتیجہ اس کے خلاف دکھائی دے رہا ہو، تو اپنے قائم کردہ مقدمات کا جائزہ لے، قرآنی بیان کو توڑنے مروڑنے کی جرأتِ بے جا نہ کرے، حتی کہ اگر کچھ سمجھ میں نہ آئے تو اپنے تحقیقی سفر کو درمیان ہی میں چھوڑ کر ''اِیمان بالغیب'' لے آئے۔

تدبر کائنات کے تین مرحلے:

۲-: پھر یہاں ایک بات اور بھی یاد رکھنے کی ہے، وہ یہ کہ شرعی نقطۂ نظر سے تکوینیات میں غور وفکر کے تین مرحلے ہوسکتے ہیں:

(۱) اشیائے عالم کے وجود سے اُن کے خالق اور صانع کے وجود پر استدلال (۲) اُن کے ہمہ وقتی نشو ونما اور تسلسل آمیز تغیرات میں غور کرکے اُن کے مدبر اور مؤثر حقیقی کی تلاش (۳) ان اشیائے عالم کے طبی اور تکوینی منافع ومفادات میں غور کرکے اُن سے استفادہ وانتفاع، اور اُن کے خالق ومالک کا تشکر وامتنان۔

مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں: ''قرآنِ کریم کو صرف پہلی حیثیت سے ان سے تعلق ہے، اس کے بعد اگر کوئی یہ سوال کرنے لگے کہ بادل کس طرح پیدا ہوتے ہیں، اور بارش کیوں کر ہوتی ہے، اور اس قسم کے حالات؛ تو قرآن سے ان کا تلاش کرنا غلطی ہے''۔ (حوالۂ سابقہ)۔

اور اِس پہلی حیثیت سے غور وفکر کا سلسلہ قرآن کریم کے اولین مخاطبین (حضراتِ صحابہؓ) کے دور ہی سے قائم ہے، حتی کہ عرب کے ایک دیہاتی کا یہ استدلال مشہور ہے: ''**البعرۃ تدل علی البعیر، وأثر الأقدام علی المسیر، فسماء ذات أبراج، وأرض ذات فجاج، لاتدل علی اللطیف الخبیر؟**'' (راستوں میں پڑی ہوئی اونٹ کی مینگنیاں بتاتی ہیں کہ اِدھر سے اونٹ گذرے ہیں، نشاناتِ قدم بتاتے ہیں کہ لوگ گذرے ہیں، تو کیا یہ برجوں والا آسمان، اور یہ پیچ در پیچ راستوں والی زمین نہیں بتائے گی کہ اُسے کسی نے پیدا کیا ہے؟)۔

۳-: ایک اور موقع پر مولانا تھانویؒ نے اِرشاد فرمایا: ''ایک مرتبہ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے کی کیا وجہ ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿یَسْـــئَـــلُـــوْنَکَ عَـــنِ الْاَهِلَّةِ﴾ ۔ (لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند آلۂ شناختِ اوقات ہیں)، جس میں وجہ اور علت نہیں بیان کی گئی، بلکہ حکمت بتلا دی گئی، اِس سے سائنسدانی کا فضول ہونا یقیناً ثابت ہوگیا۔ (اشرف التفاسیر، ج ا ص ۱۷۲)۔

۴-: حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: ''...... کسی نص شرعی نے نہ اس (حرکتِ ارض) کا اِثبات کیا ہے نہ نفی کی ہے، پس اثباتاً یا نفیاً یہ مسئلہ اِسلامی اور شرعی نہیں ہے، محض ایک عقلی مسئلہ ہے، دونوں جانب احتمال اور گنجائش ہے، اور کسی (بھی) احتمال پر کسی آیت وحدیث پر کوئی اشکال لازم نہیں آتا...... ، اور محض اس فخر کے حاصل کرنے کو یہ تفسیر کرنا کہ جس مسئلہ کو بہت تحقیق کے بعد جدید فلسفہ نے اب دریافت کیا ہے ہزاروں برس پہلے وہ مسئلہ اسلام میں حل ہو چکا ہے، محض فضول ہے۔

اول تو بعد اِثباتِ قدامت اس مسئلہ کے کوئی مخالف یہ شبہ کرسکتا ہے کہ اسلام نے اپنی تحقیقات میں قدمائے حکماء سے اقتباس کیا ہے (جیسا کہ اس کی تفصیل بھی حضرت نے لکھی ہے)، سو یہ فخر تو اور اہانت ہوگیا، دوسرے قرآن جس فن کی کتاب ہے اس میں سب سے ممتاز ہونا یہ فخر کی بات ہے، یعنی اِثباتِ توحید و اِثبات معادِ و اصلاحِ ظاہر و باطن۔ اگر سائنس کا ایک مسئلہ بھی اس میں نہ ہو کوئی عیب نہیں، اور اگر سائنس کے سب مسئلے ہوں تو فخر نہیں، قرآن کو ایسی خیر خواہی کی ضرورت نہیں۔ واللہ تعالی اعلم۔'' (امداد الفتاوی، ج ۶ ص ۱۶۰-۱۶۲)۔

۵-: ''...... جیسا کہ ابھی مذکور ہوا کہ سائنس کے مسائل اس کے مقاصد سے نہیں، بلکہ مقدماتِ مقصود سے ہیں، تو استدلال میں مقدمات ایسے ہونے چاہئیں جو پہلے سے یعنی قبل اِثباتِ مدعیٰ کے مخاطب کے نزدیک مسلّم ہوں، یا بدیہی ہوں، یا بدلیل مسلّم کرا دیئے جاویں، ورنہ ان سے مدعی پر استدلال ہی نہ ہوگا۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی، تو اب سمجھنا چاہیے کہ اگر یہ جدید تحقیقات ان آیاتِ قرآنیہ کے مدلولات و مفہومات ہوں، اور ظاہر ہے کہ عرب کے لوگ جو اول مخاطب ہیں قرآن کے، وہ بالکل ان تحقیقات سے ناآشنا تھے، تو لازم آتا ہے کہ مقدماتِ غیر مسلّمہ و غیر بدیہیہ و غیر مُثبتہ سے استدلال کیا گیا ہے، جن میں استدلال کی صلاحیت ہی نہیں ہے، تو کلام اللہ کے طرزِ استدلال پر کتنا بڑا دھبہ لگے گا'' (الانتباہات المفیدۃ ص ۴۵، ۴۶)۔

مغربی اَفکار سے متاثر تفسیری رجحانات

مولانا محمد معاویہ سعدی استاذ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

گذشتہ صفحات میں ''مغربی اَفکار سے متاثر تفسیری رجحانات'' سے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا؛ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِن اَفکار کے پس منظر پر بھی کچھ روشنی ڈال دی جائے، تاکہ اِن التباسات اور اِنحرافات کے منشا اور منبع و سرچشمہ سے بھی فی الجملہ واقفیت ہو جائے۔

جدید کفریہ نظریات میں: نیچرل اِزم (نیچریت، فطرت پرستی)، ریشنل اِزم (عقل پرستی)، سیکولر اِزم (مذہبی غیر جانبداری، یا لامذہبیت)، ڈیموکریسی (جمہوریت، عوامی حکومت)، کمیون اِزم (اشتراکیت)، نیشنل اِزم (وطنیت وقومیت)، وغیرہ نظریات عام طور سے اہلِ علم اور اہلِ قلم کے زیرِ بحث آتے رہتے ہیں، مگر اِن سب کی اصل ''ہیومن اِزم'' (اِنسانیت) ہے، اِس موضوع پر انٹرنیٹ پر بھی بعض اچھے مضامین موجود ہیں، اور برادرِ گرامی مولانا حکیم فخر الاسلام صاحب زید مجدہ (مظاہری، علیگ) نے ''نصابِ تعلیم سے متعلق'' اپنی کتاب ''الامام محمد قاسم نانوتوی کا فکر، اور بدلتے حالات میں اہلِ مدارس کی ترجیحات'' بطور خاص اِن اَفکار کے پس منظر اور پیش منظر دونوں پہلوؤں سے بہت مفید گفتگو فرمائی ہے۔

آئندہ سطور میں اپنے پیشِ نظر مضامین سے اِستفادہ کرتے ہوئے، مزید تحلیل وتجزیہ کے ساتھ، ہم پہلے ''ہیومن اِزم'' کا مختصر سا تعارف کراتے ہیں، پھر اِن شا اللہ تعالیٰ شریعت کے کن اصولوں سے اِس نظریے کی مزاحمت ہوتی ہے، حسبِ توفیق اس پر بھی روشنی ڈالیں گے۔

ہیومن اِزم (اِنسانیت) کا تعارف:

فاران کی چوٹیوں سے جس وقت اِسلام کا آفتاب طلوع ہوا، اس وقت دنیا بھر میں (یہودی، عیسائی، مجوسی، ہندومت، آریہ، بدھ مت، وغیرہ) مختلف اَدیان پائے جاتے تھے، اور سیاسی لحاظ سے مختلف مذاہب سے وابستہ بڑی بڑی حکومتیں قائم تھیں، جن میں قانون کے نام پر سربراہانِ حکومت کے چشم وابرو ہی قولِ فیصل ہوتے تھے۔

اس وقت رائج بعض ادیان اِنسانوں کے خود تراشیدہ تھے، جب کہ دوسرے بعض مذاہب، آسمانی ہونے کے باوجود ایک تو اپنی تحریف اور تبدیل شدہ حالت میں تھے، دوسرے خالقِ کائنات کی طرف سے تکمیلِ دین ﴿الیوم أكملت لكم دينكم، وأتممت عليكم نعمتي﴾ کی خوش خبری سنائے جانے سے پہلے کے تھے۔

اِس لیے جب ربانی تعلیمات اور آسمانی ہدایات سے آراستہ،عقائد، عبادات، اَخلاق، معاشرت، معاملات اور سیاست تک کے احکام پر مشتمل، ایک کامل ومکمل دین کے ساتھ، اہلِ اِسلام (صحابہ کرامؓ) دنیا کے مختلف ملکوں، خطوں اور براعظموں کی طرف نکلے تو وہاں کے نامکمل قوانین اور غیر متوازن آئینِ حکومت اِسلام کی جامع اور معتدل تعلیمات کا مقابلہ نہ کرسکے، اور بہت مختصر عرصے میں متمدن دنیا (ایشیا، افریقہ، یورپ) کے ایک بڑے حصے نے اِسلامی تعلیمات، اِسلامی تہذیب وثقافت، اِسلامی عقائد وعبادات، اور اِسلامی معاشرت ومعاملات کے سانچے میں خود کو ڈھال لینے کو ہی ترقی اور کامیابی کی علامت اور سعادتِ دارین کی ضمانت سمجھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِسلام دنیا کا سب سے مقبول ترین دین بن گیا، جس کے بڑھتے قدم کو روکنے کے لیے دیگر قوتوں نے ہر طرح کا زور صرف کیا، مگر ناکامی ونامرادی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔

ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک اِسلام کے ماننے والوں نے دین ودنیا کے تمام شعبوں میں سارے عالم کی جہاں بانی کا فریضہ (بحیثیتِ مجموعی) شاندار طریقے پر انجام دیا، اور جہالت وغفلت میں مدہوش اِنسانوں کے اندر اِحساسِ خودی پیدا کرکے، مقصدِ تخلیق سے روشناس کرایا، مادّیت ونفسانیت کی دنیا میں جینے والوں کے اندر خدا آگاہی، اور آخرت طلبی کا جذبہ بیدار کیا، صدیوں تک مشرق سے لے کر مغرب تک، شمال سے لے کر جنوب تک اِسلام کے داعیوں، مبلغوں، اور سپاہیوں کے قافلے چلتے رہے، اور خلقِ خدا کو خالقِ حقیقی سے جوڑنے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

پھر تقریباً تین سو سال پیشتر سے نبوی پیشین گوئیوں کے مطابق تکوینی طور پر، دوسروں کو جگانے والے خود ہی سونا شروع ہوگئے، راستہ دکھانے والے خود ہی بھٹکنے لگے، سنبھالنے والے خود ہی گرنے لگے، اللہ سے جوڑنے والے (نعوذ باللہ) خود ہی کٹنے لگے۔

یہاں تک کہ ایک بار پھر دنیا میں خدائی قانون کی بالادستی کے بجائے، اِنسانی جذبات کی عمل داری شروع ہوگئی، اِسلامی خلافت، اِسلامی قوانین، اِسلامی جہاد، اِسلامی تہذیب وثقافت، سب کے سب زوال اور اِنحطاط کا شکار ہوگئے۔

ادھر دوسری طرف دنیا میں کوئی اور ایسا مذہب پہلے ہی سے نہیں تھا جو اِسلامی جامعیت کا حامل اور دین ودنیا کی کامیابیوں کا ضامن ہوتا، اِس کے برخلاف ان دیگر ادیان کے مذہبی اِدارے انتہائی درجے کی بے اعتدالیوں اور ظلم وزیادتیوں میں مبتلا تھے، جس کے ردِعمل میں عوام کے اندر مذہب سے نفرت اور نتیجتاً خدا بیزاری کی ایک لہر پیدا ہوگئی، خصوصاً مغرب کے کلیسائی نظام کے خلاف پکنے والا آتش فشاں ایک فکر اور تحریک کی شکل

اختیار کرتا چلا گیا۔

سولہویں صدی عیسوی کے اواخر سے یورپ کے ایک مخصوص اور محدود طبقے میں آسمانی مذاہب کے اِنکار اور مذہبی اِداروں کی مخالفت کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا، جو اٹھارویں اور انیسویں صدی تک آتے آتے خود ایک مذہب بن گیا۔

اِنکارِ مذاہب کی بنیاد پر قائم اِسی فلسفہ کا نام ''ہیومن اِزم'' (اِنسانیت) ہے، جس کا رشتہ قدیم یونانی فلسفے کی بعض شاخوں سے بھی ملتا ہے، یہ جدید مذہب: اِنسان کو کسی غیر مرئی (مابعد الطبیعاتی) ذات اور قوت کا ماتحت نہ مان کر، خود مختار اور مستقل بالذات مانتا ہے، اِسی لیے نہ تو وہ خدائی احکام اور آسمانی مذہب کا پابند ہے، نہ ہی کسی رسول اور نائبِ خدا کی تشریحات و تشریعات کا، اور اِسی لیے اس کے ہاں خیر و شر کا بھی کوئی معیار نہیں ہے، بلکہ اِنفرادی امور میں جس چیز کو اِنسان خود اپنے لیے شر سمجھے وہ شر ہے، جس کو خیر سمجھے وہ خیر ہے، اور اِجتماعی معاملات میں جس چیز سے دوسرے اِنسانوں کو ایذا پہنچتی ہو، یا اکثر اِنسان غلط سمجھتے ہوں وہ شر ہے، اور جس کو خیر سمجھتے ہوں وہ خیر ہے۔

مثلاً زنا: اِنسانیت کے اِس دین میں فی نفسہ کوئی شر اور برائی نہیں ہے، اِسی لیے برضائے طرفین جائز ہے، اور بالجبر اِس لیے جائز نہیں ہے کہ دوسرے کی اِیذا کا سبب ہے، باقی شرم وحیا، عفت و پاک دامنی، خوفِ خدا اور آخرت کی مسئولیت کا وہاں کوئی تصور نہیں۔

اِس مذہب میں چوں کہ آسمانی مذاہب کا اِنکار بطور خاص شامل ہے اِس لیے نتیجتاً خدا کے وجود اور اس کے اِختیارات کا مسئلہ بھی ایک پیچیدہ موضوع ہے، جس کا ابھی تک کوئی واضح حل تلاش نہیں کیا جاسکا ہے، زیادہ تر مفکرین کی رائے یہ ہے کہ موجوداتِ عالم: تخلیقِ خالق تعالی کے بجائے، کسی مادے کے اِرتقائی عمل کا نتیجہ ہیں، اور (مذہب و شرعی تعلیمات سمیت!) دنیا کی ہر چیز میں تغیر اور تدریج کا ایک سلسلہ جاری ہے، جس کے انجام کا کوئی یقینی اندازہ نہیں ہے۔

اِس مذہب میں چوں کہ اِنسان کو مستقل بالذات مانا گیا ہے اِس لیے (علمِ غیب کے بجائے) اِنسانی عقل، اِنسانی تجربہ اور اِنسانی مشاہدہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، جس کے لیے نیچرلزم (مادی بنیاد) اور ریشنلزم (عقلی بنیاد) کی اصطلاح وضع کی گئی ہے، اور اِن دونوں ذرائع سے حاصل ہونے والے علم کو ''سائنسی علم'' کہا جاتا ہے، علمی تحقیقات میں مذہب کا، کتاب وسنت (غیبی علوم) کا حوالہ نہ دینے کو، اور صرف اِن اِنسانی ذرائع پر اِنحصار کرنے کو ''حقیقت پسندی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مذہبی اور شرعی بنیادوں پر حق و باطل کی بحث نہ چھیڑنے کو ''اِعتدال پسندی''، اور مذہبی غیرت کا اِظہار نہ کرنے کو ''رواداری'' کہا جاتا ہے۔

اِسی طرح کسی بھی غیر مرئی طاقت کی ماتحتی اور پابندی کے بجائے: فکری آزادی، اخلاقی آزادی، مذہبی آزادی، آزادیٔ نسواں، خاتمۂ غلامی وغیرہ اِس مذہب کے بنیادی مقاصد ہیں، ترقی پسندی، جدت پسندی، اِفادیت پسندی، اِنسانی قدریں، خدمتِ اِنسانیت، اِنسانی حقوق کا تحفظ وغیرہ اس مذہب کی خاص اصطلاحات ہیں، جن کا لحاظ نہ کرنے والوں کے لیے: قدامت پسند، متشدد، کٹر پنتھی، بنیاد پرست، دقیانوس، مقلد، جمود کا شکار، وغیرہ دفعات لگائی جاتی ہیں۔

چوں کہ اِنسانیت کے اِس تصور کی بنیاد مادہ کے وجود اور اس کے اِرتقا پر قائم ہے، اِس لیے اس میں خیر وشر اور نفع وضرر کی ساری بحث مادی نقطہ نظر سے کی جاتی ہے، کسی روحانی، نورانی اور مابعد الطبیعاتی نتیجے کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا، فرشتے، معجزات، جنات، قیامت، آخرت، حساب وکتاب اور پھر جنت وجہنم وغیرہ مابعد الطبیعاتی عقائد، ان لوگوں کے ہاں خیالات واوہام ہیں، جن کا حقیقی (مادی) دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اِسی مادی بنیاد کے نتیجے میں اِس طبقے کی طرف سے ایک تصور یہ بھی پیش کیا گیا کہ جنت وجہنم کی مذہبی اصطلاحات کا وہ مطلب نہیں ہے جو مذہبی شخصیات نے باور کرا رکھا ہے، کہ مرنے کے بعد عقیدہ وعبادت کی بنیاد پر ان چیزوں کا سامنا کرنا پڑے گا، بلکہ ان کے نزدیک جنت وجہنم اِسی دنیا کی ترقی یافتہ شکل کا نام ہے، جو لوگ اِس دنیا کی ترقی میں حصہ لے رہے ہیں وہ ''عملِ صالح'' میں لگے ہوئے ہیں، لہٰذا وہ اِس دنیا کی (جنت) عیش وعشرت، بے خوفی، بے غمی وغیرہ کے مستحق ہیں، اور جو لوگ حلال وحرام کی بحثوں اور جائز وناجائز کے فتووں کے ذریعے اِس دنیا کی ترقی سے مانع بن رہے ہیں وہ عملِ صالح سے دور ہیں، لہٰذا وہ اِس دنیا کی (جہنم) خوف ودہشت، ذلت ورسوائی اور سزا وعقاب وغیرہ کے مستحق ہیں۔

نفس وشیطان کی مرغوبات پر مشتمل اِنسانیت کے اِس مذہب کو اِیجادات واِختراعات کی کمک مل جانے کی وجہ سے، غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی، اور اِس نوزائیدہ اور خود تراشیدہ مذہب نے اخلاقیات وروحانیت سے عاری ہونے کے باوجود، عام اِنسانوں کے قلوب میں جگہ بنانے میں زبردست کامیابی حاصل کرلی؛ سوائے ایک مخصوص اور محدود طبقے کے جس کو حدیث شریف میں ''طائفہ منصورہ''، اور قرآن شریف میں ﴿عباد اللّٰہ المخلَصین﴾ (اللہ کے منتخب اور باتوفیق بندے) کہا گیا ہے۔